ایک غیر مسلم فلسفی کے قلم سے

# اسلام کے پیغمبر




راما کرشنا راؤ

النخالد پرنٹنگ ایجنسی سول لائن فیصل آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مسلم مؤرخین کے مطابق (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت ریگ زارِ عرب میں ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی۔ محمدؐ کے معنی ہیں "نہایت تعریف کیا گیا"۔ میرے نزدیک آپؐ تمام فرزندان عرب میں سب سے زیادہ عالی دماغ انسان ہیں۔ اس دشوار گذار لالہ رنگ ریگستان میں اپنے سے پہلے اور بعد میں جنم لینے والے تمام دانشوروں اور فرمانرواؤں کے بالمقابل آپؐ کی ذات سب سے زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

جب آپؐ کا ظہور ہوا تو عرب ایک ریگستان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی بے آب و گیاہ اور تہی دامن ریگستان میں (حضرت) محمدؐ کی زبردست روحانی طاقت نے ایک نئی زندگی کی تعمیر کی ـــــ ایک نئی زندگی، ایک نئی تہذیب، ایک نئی ثقافت، ایک نئی مملکت جس کی سرحدیں مراقش سے جزائرِ ہند تک پھیلی ہوئی تھیں اور جس نے تین براعظموں ـــــ ایشیا، افریقہ اور یوروپ کے اندازِ فکر اور طرزِ زندگی کو متاثر کیا۔

جب میں نے پیغمبر اسلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں لکھنے کے متعلق سوچا تو میں قدرے تذبذب میں تھا کیونکہ یہ ایک ایسے مذہب کے بارے میں قلم اٹھانا تھا جس کا میں پیرو نہیں ہوں۔ یہ ایک نازک معاملہ ہے کیونکہ دنیا میں مختلف مذاہب سے وابستگی رکھنے والے افراد پائے جاتے ہیں اور ایک ہی مذہب کے ماننے والے بھی مختلف فرقوں اور مسلکوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں

اگرچہ کبھی کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مذہب خالصتہً ایک ذاتی معاملہ ہے تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذہب میں عیاں اور نہاں کائنات پر محیط ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ کبھی کبھی اور کسی نہ کسی طرح ہمارے قلب و روح اور ذہن کے شعوری، تحت الشعوری اور لاشعوری، قیاسی اور واقعی گوشوں میں ایک جوئے آہستہ خرام کی طرح سرایت کرجاتا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت اپنی انتہائی اہمیت کو پہنچ جاتا ہے جب ہم اس یقین سے دوچار ہوتے ہیں کہ ہمارا ماضی، حال اور مستقبل ایک نازک حریری دھاگے سے لٹکا ہوا ہے۔ اگر ہم زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کامرکز ثقل ہمیشہ ایک شدید قسم کے تناؤ کی حالت میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی دوسرے مذہب کے متعلق کم سے کم لب کشائی کرنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ بر ایں صورت ہمارے مذاہب کا ہمارے دلوں کے نہاں خانوں میں روپوش رہنا اور ہمارا مہر بہ لب ہونا ہی مناسب ہے۔

لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ ہماری زندگی خواہی نخواہی، بالواسطہ یا بلا واسطہ دوسرے بے شمار افراد سے وابستہ ہے۔ ہم ایک ہی زمین سے حاصل ہونے والی غذا کھاتے ہیں، ایک ہی چشمے کا پانی پیتے ہیں اور ایک ہی ماحول کی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ اپنے نظریات پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے بھی اگر ہم کسی اور مقصد سے نہیں صرف اپنے ماحول سے بہتر مطابقت پیدا کرنے کی خاطر ہی ایک حد تک اپنے ہمسایوں کے اندازِ فکر اور سرچشمۂ عمل کو جاننے کی کوشش کریں تو یہ بات ہمارے لیے مفید ہوگی۔ اس نقطۂ نگاہ سے مناسب ہوگا کہ ہم دنیا کے تمام مذاہب کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہم اپنے قریب اور دور کے پڑوسیوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے تعلق سے معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

مزید برآں ہمارے خیالات درحقیقت اتنے منتشر و پراگندہ نہیں ہوتے جتنا کہ بظاہر نظر آتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ عظیم مذاہب اور زندۂ جاوید عقائد کی شکل میں مربوط و مرتکز ہو کر اس کرۂ ارض پر آباد لاتعداد انسانوں کی راہ نمائی کرنے اور ان میں جذبۂ عمل بیدار کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اگر ہمارا نصب العین ایک آفاقی شہری بننا ہے تو ایک طرح سے ہمارا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ ہم دنیا کے ان عظیم مذاہب اور فلسفہ ہائے حیات سے واقفیت حاصل کرنے کے بساط بھر کوشش کریں جنھوں نے انسانی ذہنوں پر حکمرانی کی ہے۔

ان تمہیدی کلمات کے باوجود مذہب کی جولانگاہ جہاں اکثر جذباتیت اور عقلیت کے

درمیان آویزش پائی جاتی ہے اتنی پُرخطر ہے کہ ذہن پر ان سادہ لوحوں کا خیال طاری رہتا ہے جو اس مقام سے بھی آگے پرواز کرنے سے نہیں چوُکتے۔ جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایک دوسرے پہلو سے بھی پیچیدہ ہے میری تحریر کا موضوع ایک ایسے مذہب کے اصول ومبادی ہیں جو خود بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور جس کے پیغمبر (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تاریخی شخصیت کے مالک ہیں۔ سرولیم موئر جیسا متعصب نقاد بھی قرآن کے بارے میں کہتا ہے" غالباً دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں جو بارہ (اب پندرہ) صدیوں سے اتنے صحتِ متن کے ساتھ باقی ہو" میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ پیغمبر اسلام (حضرت) محمدؐ خود ایک ایسی تاریخی شخصیت کے مالک ہیں کہ جن کی زندگی کا ہر واقعہ انتہائی احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے اور اس کے متعلق ادنیٰ ترین جزئیات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لی گئی ہیں۔ آپؐ کی حیات اور کارنامے سربستہ راز نہیں ہیں اور ہمیں آپ کے بارے میں مستند اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی خاص جستجو اور کدوکاوش کی ضرورت نہیں۔

میرا کام اس لیے اور بھی آسان ہو گیا کہ اب غالباً وہ وقت گذر چکا ہے کہ جب اسلام کو اس کے ناقدین نے سیاسی اور دیگر وجوہات کی بنا پر غلط رنگ میں پیش کیا تھا۔ پروفیسر بیون کیمبرج کی تاریخ عہد وسطیٰ میں لکھتا ہے" انیسویں صدی کے آغاز سے قبل محمدؐ اور اسلام کے بارے میں جو واقعات شائع ہوئے ہیں آج ان کی حیثیت ادبی اعجوبہ کاریوں سے زیادہ نہیں ہے" میرے لیئے یہ مقالہ لکھنے کا مسئلہ یوں سہل ہو گیا کہ آج ہمیں اس قسم کی مسخ شدہ تاریخی حقائق پر انحصار نہیں کرنا پڑتا اور اسلام سے متعلق گمراہ کن حقائق کی نشاندہی کرنے میں ہمارا وقت ضائع نہیں ہوتا۔

مثلاً اسلام کی بزورِ شمشیر اشاعت کا نظریہ اب کسی بھی قابل ذکر حلقہ میں سننے کو نہیں ملتا۔ اب اسلام کا یہ اصول کہ دین میں جبر نہیں ہے ایک معروف حقیقت ہے۔ مشہور زمانہ مورخ گبن کہتا ہے" مسلمانوں کے ساتھ یہ تکلیف دہ اصول زبردستی متعلق کر دیا گیا ہے کہ ان پر دوسرے مذاہب کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے" متذکرہ بالا ممتاز مورخ کی رائے میں یہ جاہلانہ اور متعصبانہ الزام قرآن؛ مسلمان فاتحین کی تاریخ اور مسیحی طریقہ عبادت کے سلسلہ میں ان کی عوامی اور قانونی رواداری کی روشنی میں باطل قرار پاتا ہے۔ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی زندگی میں حاصل ہونے والی عظیم ترین کامیابی خالصتہً اخلاقی قوت کا ثمرہ تھی شمشیرزنی کا نہیں

وہ عرب جو اتنی معمولی سی وجہ اشتعال پر کہ ایک قبیلے کے مہمان کا اونٹ غلطی سے دوسرے قبیلے کی چراگاہ میں داخل ہوگیا چالیس سال تک لڑ سکتے تھے اور اس وقت مصروف جنگ رہ سکتے تھے جب تک کہ ستر ہزار انسانی جانیں ضائع نہیں ہوگئیں اور دونوں قبیلوں کے صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا خطرہ پیدا نہیں ہوگیا ان ہی خونخوار عربوں کو پیغمبر اسلامؐ نے اس حد تک ضبطِ نفس اور ضابطہ پسندی سکھائی کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی نماز ادا کرتے تھے۔

جب مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں اور جب ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ آپؐ کو محض اپنے دفاع کی خاطر تلوار اٹھانی پڑی تو پیغمبر اسلامؐ نے جنگ کی حکمتِ عملی کو ہی یکسر بدل ڈالا۔ آپؐ کی حیات میں ہونے والی تمام جنگوں میں، جبکہ پورا جزیرہ نمائے عرب آپؐ کے زیرِ نگیں آگیا، ہلاک ہونے والوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔ آپؐ نے وحشی عربوں کو جنگ کی رستخیز میں اللہ رب العالمین کی فرداً فرداً نہیں اجتماعی طور پر عبادت کرنا سکھایا۔ جب بھی نماز کا وقت آتا تھا —— اور یہ وقت ہر روز پانچ مرتبہ آتا تھا —— تو باجماعت نماز نہ صرف یہ کہ ترک نہیں کی جاتی تھی بلکہ ملتوی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک گروہ اپنے رب کے حضور میں سربسجدہ ہوتا تھا اور دوسرا گروہ دشمن سے مصروفِ پیکار رہتا تھا۔ جب پہلا گروہ نماز سے فارغ ہوجاتا تو دوسرا گروہ نماز میں مشغول ہوجاتا اور پہلا گروہ محاذ جنگ سنبھال لیتا تھا۔

آپؐ کے عالمگیر اخوت اور انسانی مساوات کے پیغام نے انسانیت کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تمام بڑے مذاہب نے ان اصولوں کی تعلیم دی ہے لیکن پیغمبر اسلامؐ نے ان پر عمل کر کے دکھایا۔ اس کی اہمیت غالباً کچھ عرصہ بعد تب محسوس کی جانے گی جب بین الاقوامی

شعور بیدار ہوگا، نسلی تعصبات ختم ہو جائیں گے اور ایک عالمگیر انسانی برادری کا تصور وجود میں آئے گا۔

سروجنی نائیڈو اسلام کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں" اسلام پہلا مذہب ہے جس نے نہ صرف جمہوریت کی تعلیم دی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھایا۔ جب مسجد کے مینار سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور نمازی مسجد میں جمع ہوتے ہیں تو دن میں پانچ مرتبہ اسلامی جمہوریت کا منظر نظر کے سامنے ہوتا ہے کیونکہ اس وقت شاہ و گدا پہلو بہ پہلو سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔" یہ عظیم ہندوستانی شاعرہ مزید لکھتی ہیں" میں اسلام کی اس ناقابلِ تقسیم وحدت سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہوں جو انسانوں کو غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کا بھائی بنا دیتی ہے۔ اگر آپ لندن میں مصر، الجیریا، ہندوستان یا ترکی کے رہنے والے مسلمانوں سے ملیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کے نزدیک یہ چیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ان میں سے کسی کا تعلق مصر کی سرزمین سے ہے اور ہندوستان کس کا وطن ہے۔"

مہاتما گاندھی اپنے منفرد طرز میں رقمطراز ہیں" یہ کہا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ جنوبی افریقہ میں اسلام کے فروغ سے خائف ہیں ـــــ اسلام جس نے اسپین کو تہذیب سے آشنا کیا، اسلام جو مشعلِ ہدایت لے کر مراکش پہنچا اور جس نے دنیا کو اخوت و محبت کا پیغام دیا۔ جنوبی افریقہ کے یورپین اسلام سے غالباً اس وجہ سے خوفزدہ ہیں کہ اس کے پیروکار سفید فام نسل کے لوگوں سے مساوات کا مطالبہ کریں گے اگر ایسا ہے تو ان کا خوفزدہ ہونا بجا ہے۔ اگر اخوت ان کی نظر میں کوئی گناہ ہے اور رنگ دار نسلوں کو برابری کا درجہ دینے سے اگر وہ ڈرتے ہیں تو اسلام سے ان کا خائف ہونا حق بجانب ہے۔"

ہر سال حج کے موقع پر دنیا اسلامی مساوات اور اخوت و محبت کا وہ عظیم الشان منظر دیکھتی ہے جب رنگ، نسل اور منصب کے تمام امتیازات یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ یورپ، افریقہ، ایران، ہندوستان اور چین کے باشندے مکہ میں اس طرح جمع ہوتے ہیں جیسے وہ سب اللہ کے کنبے کے افراد ہوں۔ وہ سب ایک ہی قسم کے لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر شخص دو بغیر سلی چادروں میں ملبوس ہوتا ہے۔ ایک چادر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری کو وہ اپنے کندھے پر ڈالے ہوئے ہوتا ہے۔ سب کے سر منڈے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور کسی نمود و نمائش کے بغیر ان کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوتے ہیں" اے خدا میں حاضر ہوں، تیرے حکم کی تعمیل کے لیے میں حاضر ہوں، تو ایک ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔" ان کے درمیان چھوٹے اور بڑے کا فرق ظاہر کرنے

والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور ہر حاجی اسلام کی عظمت کا لافانی نقش لے کر اپنے گھر لوٹتا ہے۔
پروفیسر ہرگرونج کے الفاظ میں پیغمبر اسلامؐ کی قائم کردہ جمیعت اقوام نے بین الاقوامی اتحاد اور انسانی بھائی چارے کے اصولوں کو ایسی آفاقی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے جو تمام قوموں کے لیے مشعلِ راہ ہیں"۔
وہ مزید کہتا ہے "جمیعت اقوام کے تصور کو عملی شکل دینے میں اسلام نے جو کردار ادا کیا ہے دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی"۔

پیغمبر اسلامؐ نے جمہوری طرز حکومت کو اس کی بہترین شکل میں نافذ کیا۔ خلیفہ عمرؓ، خلیفہ علیؓ (جو پیغمبر اسلامؐ کے داماد بھی تھے) خلیفہ منصور عباس جو خلیفہ مامون کے بیٹے تھے اور دوسرے خلفاء اور بادشاہوں کو اسلامی عدالتوں میں عام انسانوں کی طرح پیش ہونا پڑا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج بھی نام نہاد سفید فام مہذب نسلیں سیاہ فام نیگرو لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں؟ پھر تصور کیجئے (حضرت) بلالؓ کے مرتبہ و مقام کا جو انھیں اب سے چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلامؐ کے دور میں ایک حبشی غلام ہونے کے باوجود حاصل تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مؤذن ہونا باعث اعزاز سمجھا جاتا تھا اور یہ اعزاز اسی حبشی غلام کو عطا کیا گیا۔ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے (حضرت) بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور یہ موٹے موٹے ہونٹوں والا سیاہ فام حبشی اذان دینے کے لیے دنیائے اسلام کی سب سے زیادہ مقدس اور تاریخی عمارت کعبہ کی چھت پر چڑھ گیا۔ اسی وقت کچھ مغرور و متکبر عربوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا "برا ہو اس کالے حبشی غلام کا جو کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر اذان دے رہا ہے"۔

شاید اسی نسلی تفاخر اور جاہلی پندار کے جواب میں آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا "تمام تعریف اور شکر اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں عہد جاہلیت کی تمام برائیوں اور بے جا غرور سے نجات عطا فرمائی۔ اے لوگو! جان لو کہ تمام انسان دو گروہوں میں منقسم ہیں ——— پرہیزگار اور اللہ سے ڈرنے والے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک معزز ہیں۔ دوسرے نافرمان اور سرکش، جو اللہ کی نظر میں مقہور و مغضوض ہیں۔ ورنہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا"۔

بعد میں آپؐ کے ارشادات کی توثیق قرآن نے ان الفاظ میں کی "اے انسانو! بیشک ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت کے جوڑے سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ افضل وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور خدا سے ڈرنے والا ہے"۔

پیغمبر اسلامؐ نے ایک ایسا زبردست ذہنی انقلاب برپا کیا کہ اعلیٰ نسب شرفائے عرب نے اسی حبشی غلام سے اپنی بیٹیاں منسوب کرنے کی پیشکش کی۔ خلیفۂ ثانی امیر المومنین (حضرت) عمرؓ جنھیں تاریخ میں فاروق اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جب اس حبشی غلام کو دیکھتے تو تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور ان الفاظ میں ان کا استقبال کرتے "آپ ہیں ہمارے سردار، ہمارے آقا" قرآن اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے وقت کے مغرور ترین عربوں میں کتنی عظیم تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اسی لیے عظیم جرمن شاعر گوئٹے نے قرآن کے بارے میں کہا تھا "یہ کتاب ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اپنا بے پناہ اثر چھوڑتی رہے گی" اور غالباً اسی بنا پر جارج برنارڈ شا نے کہا تھا "اگر آئندہ سو سال میں کوئی مذہب انگلینڈ ہی نہیں بلکہ یورپ پر حکمرانی کر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے"

اسلام کے اسی جمہوری مزاج نے عورت کو مرد کی غلامی سے نجات دلائی۔ سر چارلس ایڈورڈ آرکیبالڈ ہملٹن کہتا ہے "اسلام انسان کی فطری معصومیت سے دنیا کو روشناس کراتا ہے۔ اسلام کے مطابق مرد اور عورت کی تخلیق ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے، ان میں ایک ہی روح ہے اور انھیں ذہنی، روحانی اور اخلاقی کارنامے انجام دینے کی یکساں صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں" عربوں میں یہ روایت تھی کہ صرف مرد ہی وراثت کا حقدار ہے کیونکہ وقت پر وہی شمشیر کے جوہر دکھا سکتا ہے۔ لیکن اسلام نے صنف نازک کے حقوق کا دفاع کیا اور اسے اپنے والدین کی وراثت میں حقدار ٹھہرایا۔ صدیوں پہلے اس نے عورتوں کو جائیداد میں ملکیت کے حقوق دیئے۔ بارہ صدیوں بعد انگلینڈ نے جو جمہوریت کا گہوارہ کہلاتا ہے اس اصول کو اپنایا اور ۱۸۸۱ء میں شادی شدہ عورتوں کے حقوق سے متعلق ایک قانون پاس کیا۔ لیکن سینکڑوں سال پہلے پیغمبر اسلامؐ نے اعلان کیا تھا "عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں اور ان کے حقوق کا احترام کیا جانا چاہیے" "خبردار! عورتوں کے ساتھ انھیں دیے گئے حقوق کے مطابق سلوک کیا جائے"

اگرچہ اسلام کا کسی مخصوص سیاسی یا معاشی نظام سے براہِ راست تعلق نہیں لیکن جہاں تک انسان کے طرزِ عمل پر اثر انداز ہونے والے سیاسی اور معاشی معاملات کا تعلق ہے اس نے بالواسطہ طور پر معاشی زندگی کے لیے کچھ انتہائی اہم اصول وضع کیے ہیں۔ پروفیسر میسگنن کے مطابق "اسلام متضاد انتہاؤں کے درمیان توازن قائم کرتا ہے اور اس کی نظر ہمیشہ کردار سازی پر ہوتی ہے جو تہذیب کی بنیاد ہے۔" اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام اپنے قانونِ وراثت اور منظم و لازمی نظامِ زکوٰۃ کو کام میں لاتا ہے۔ اور اجارہ داری، سود خوری، غیر حاصل شدہ آمدنیوں اور منافعوں کو پہلے ہی متعین کر لینا، منڈیوں پر غاصبانہ قبضے، ذخیرہ اندوزی اور اشیا کی مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتوں میں اضافہ کرنے جیسی سماج دشمن معاشی سرگرمیوں کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ قمار بازی اسلام میں حرام ہے۔ تعلیم گاہوں، مسجدوں، شفاخانوں کی مالی اعانت کرنا، کنوئیں کھودنے اور یتیم خانے قائم کرنے کے لیے روپیہ خرچ کرنا اسلام میں دولت کا بہترین مصرف شمار کیا جاتا ہے۔ یتیم خانے پہلی مرتبہ پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات کے زیرِ اثر وجود میں آئے۔ یتیم خانے اپنے قیام کے لیے آپ کے ممنونِ احسان ہیں جو خود بھی یتیم پیدا ہوئے تھے۔ کارلائل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کہتا ہے "یہ کارِ خیر اس بات کا غماز ہے کہ اس فرزندِ صحرا نے اپنے دل میں موجزن انسان دوستی، خدا ترسی اور مساوات کے جذبات کو ان کی فطری زبان عطا کی۔"

ایک مورخ کہتا ہے کہ کسی عظیم انسان کی عظمت متعین کرنے کے تین پیمانے ہیں۔ کیا وہ اپنے معاصرین کی نظر میں ایک کھرے اور اعلیٰ کردار کا مالک تھا؟ کیا وہ اپنے وقت کے مقررہ معیار سے بلند تر تھا؟ کیا وہ تمام دنیا کے لیے اپنے پیچھے ایک لازوال ورثہ چھوڑ کر گیا؟ اس فہرست میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن عظمت کی تین کسوٹیوں پر (حضرت) محمدؐ کی ذات بہ تمام و کمال کھری اترتی ہے۔ موخرالذکر دو خوبیوں سے متعلق

شواہد پہلے ہی پیش کیے جا چکے ہیں۔

عظمت کے تین پیمانوں میں سے پہلا پیمانہ یہ ہے کہ کیا پیغمبر اسلامؐ اپنے معاصرین کی نظر میں ایک بے داغ کردار کے مالک تھے؟

تاریخ گواہ ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام معاصرین خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن، زندگی کے ہر شعبے اور انسانی سرگرمیوں کے ہر میدان میں پیغمبر اسلامؐ کی اعلیٰ خوبیوں، ان کی بے داغ ایمان داری، اخلاقی اوصاف، بے پناہ خلوص اور شبہ سے بالاتر امانت و دیانت کے معترف تھے یہاں تک کہ یہودی اور وہ لوگ جو آپؐ کی دعوت پر ایمان نہیں لائے تھے ذاتی معاملات میں آپؐ کو ثالث بناتے تھے کیونکہ وہ آپؐ کی غیر جانبداری پر کامل یقین رکھتے تھے حتیٰ کہ آپؐ کے پیش کردہ دین کو قبول نہ کرنے والے بھی کہتے تھے "اے محمد! ہم تمھیں جھوٹا نہیں کہتے لیکن ہم اس کا انکار کرتے ہیں جس نے تم پر کتاب اتاری اور تمھیں رسول بنا کر بھیجا۔" وہ سمجھتے تھے کہ آپؐ پر کسی جن یا بھوت کا اثر ہے۔ آپ کو اس اثر سے چھڑانے کے لیے وہ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن ان کے بہترین انسانوں نے دیکھا کہ آپؐ ایک انوکھی بصیرت کے مالک ہیں اور پھر وہ اس بصیرت کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے۔ پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ حیات کا ایک اور امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپؐ کے قریب ترین رشتہ دار، آپؐ کے محبوب چچیرے بھائی اور آپؐ کے جگری دوست جو آپؐ کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ آپؐ کے پیغام کی صداقت کے دل و جان سے معترف تھے اور آپؐ کے دعویٰ نبوت کو برحق سمجھتے تھے۔ اگر یہ شریف و ذہین اور تعلیم یافتہ مرد و زن جو آپؐ کی نجی زندگی سے بخوبی واقف تھے آپؐ کے کردار میں دھوکا، فریب یا دنیوی اغراض کی ہلکی سی جھلک بھی دیکھتے یا آپؐ کی بات پر انھیں یقین کامل نہ ہوتا تو آپؐ کا اخلاقی نشاۃ ثانیہ، اور روحانی بیداری اور معاشرتی اصلاح کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا اور آپؐ کا تعمیر کردہ ڈھانچہ ایک لمحہ میں زمیں بوس ہو جاتا۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ آپؐ کے پیروکاروں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے بہ طیب خاطر آپؐ کو اپنا راہنما تسلیم کر لیا تھا۔ انھوں نے آپؐ کی خاطر ہر تکلیف اور خطرہ کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے سماجی مقاطعوں سے پیدا شدہ انتہائی جاں گسل تکالیف اور ذہنی اذیتوں کے عالم میں حتیٰ کہ موت کے زیر سایہ بھی آپؐ پر یقین و اعتماد کا اظہار کیا، آپؐ کے احکامات کی تعمیل کی اور آپؐ کی تعظیم و تکریم میں فرق نہ آنے دیا۔ کیا یہ سب کچھ ممکن تھا اگر انھیں اپنے رہنما کی راست بازی پر ہلکا سا بھی شبہ ہوتا؟

اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپؐ کا دل وحشیانہ سلوک پر تڑپ اٹھے گا جو ان معصوم مردوں اور عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ایک بے قصور عورت (حضرت) سمیہؓ کا جسم برچھیاں مار مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ عبرت کے لیے (حضرت) یاسرؓ کی ٹانگیں دو اونٹوں

سے باندھ کر انھیں مخالف سمتوں میں ہانک دیا گیا۔ (حضرت) خباب بن ارتؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا اور بے رحم اذیت رساں اپنی ٹانگیں ان کے سینے پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکیں جس کے نتیجہ میں ان کے جسم کی چربی پگھل کر باہر نکل آئی۔ (حضرت) خباب بن عدیؓ کے اعضا کاٹ کر اور ان کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں نہایت سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ اس اذیت رسانی کے دوران جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ یہ چاہیں گے کہ ان کی جگہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے جو اس وقت اپنے اہل خاندان کے ساتھ اپنے گھر میں آرام فرما رہے تھے تو اس مظلوم نے بآواز بلند کہا کہ وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کانٹا چبھنے جیسی ادنیٰ تکلیف سے بچانے کے لیے خود کو، اپنے خاندان اور بچوں کو نیز اپنا سب کچھ بخوشی قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس طرح کے متعدد دل گداز واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سب واقعات کیا ظاہر کرتے ہیں؟ آخر کیوں اسلام کے ان بیٹوں اور بیٹیوں نے نہ صرف خود کو ہمہ تن (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وابستہ کر دیا تھا بلکہ اپنے جسم اور جان و دل آپ پر نثار کر دیئے تھے؟ کیا یہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قریبی پیروکاروں کا بے پناہ جذبۂ عقیدت و ایقان نہ تھا؟ کیا یہ واقعات آپؐ کے اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفوضہ مشن کے لیے آپؐ کی مکمل خود سپردگی کو ظاہر نہیں کرتے؟

ابتدائی دور میں آپؐ کے گرد جمع ہونے والے کم حیثیت یا معمولی ذہنی سطح کے لوگ نہیں تھے بلکہ مکہ کے بہترین اور شریف ترین عالی دماغ انسان تھے۔ یہ بلند مرتبہ، عالی منصب، دولت مند اور مہذب افراد تھے۔ یہ آپؐ کے وہ قریبی عزیز اور رشتہ دار تھے جو آپؐ کی گھریلو اور گھر سے باہر کی زندگی سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ اولین چاروں خلفاء جن کا شمار اپنے وقت کے سربرآوردہ اشخاص میں ہوتا تھا، اسی ابتدائی دور میں داخل اسلام ہوئے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں لکھا ہے "(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیات میں کامیاب ترین انسان تھے"۔ لیکن یہ کوئی حادثاتی کامیابی نہیں تھی اور نہ ہی یہ کوئی نعمت غیر مترقبہ تھی۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ آپ اپنے معاصرین کی نظر میں ایک سچے اور کھرے انسان تھے، در یہ کہ آپؐ ایک قابلِ ستائش اور جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔

(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ میں تو اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکتا ہوں۔ آپؐ کی شخصیت کے کتنے دل آویز اور مختلف النوع مظاہر ہیں! (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بحیثیت سپہ سالار، بحیثیت حکمراں، بحیثیت جنگ آزما، بحیثیت تاجر، بحیثیت معلّم، بحیثیت فلسفی، بحیثیت سیاستداں، بحیثیت خطیب، بحیثیت یتیموں کے مربّی، بحیثیت غلاموں کے محافظ، بحیثیت عورتوں کے نجات دہندہ، بحیثیت منصف اور بحیثیت خدارسیدہ انسان اور ان تمام شاندار کرداروں اور انسانی سرگرمیوں کے ان تمام شعبوں میں آپؐ قابلِ رشک شخصیت کے مالک تھے۔

یتیمی انتہائی کس مپرسی اور بے چارگی کا دوسرا نام ہے اور اس زمین پر آپؐ کی زندگی کا آغاز اسی حالت میں ہوا۔ شہنشاہیت مادّی طاقت کا نقطۂ عروج ہے اور آپؐ کی زندگی اسی حیثیت میں اختتام کو پہونچی۔ ایک یتیم بچے اور ستم رسیدہ مہاجر سے لے کر ایک پوری قوم کے دنیاوی اور روحانی پیشوا اور اس کی قسمت کا مالک ہونے کے حیثیت تک پہنچتے ہیں۔ آپؐ کو جن آزمائشوں تحریصوں، تغیرات و انقلابات اندھیروں اجالوں، نکبت و عظمت اور نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ آپؐ نے ان سب سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے اور زندگی کے ہر میدان میں آپؐ ایک مثالی انسان ثابت ہوئے۔ آپؐ کے کارنامے زندگی کے کسی ایک خاص پہلو تک محدود نہیں بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات پر محیط ہیں۔

اگر عظمت کا راز کسی ایسی قوم کی تطہیر میں پوشیدہ ہے جو سرتاپا وحشت و بربریت کا شکار اور اخلاقی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہو تو وہ شخصیت جس نے عربوں جیسی انتہائی پستیوں میں گری ہوئی قوم کو یکسر بدل کر رکھ دیا، اسے عظمت و شائستگی کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا اور علم و تہذیب کا مشعل بردار بنایا

ہر لحاظ سے نظر [illegible] ہے۔ اگر کسی معاشرہ کے متضاد عناصر کے درمیان محبت [illegible] کا رشتہ [illegible] عظمت کی نشانی ہے تو یہ امتیاز پیغمبر اسلامؐ کے حصہ میں آتا ہے۔ اگر توہمات کے شکار اور باطل [illegible] گروہ کے لوگوں کی اصلاح کا نام عظمت ہے تو پیغمبر اسلامؐ نے ہزارہا انسانوں کو توہم پرستی اور بے جا خوف سے نجات دلائی۔ اگر عظمت کا تصور اعلیٰ اخلاق کا مظہر ہونے سے وابستہ ہے تو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے دوست اور دشمن 'امین' اور 'صادق' کہہ کر پکارتے تھے۔ اگر ایک فاتح کو عظیم انسان کہا جا سکتا ہے تو ہمارے سامنے ایک ایسی شخصیت آتی ہے جس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک بے سہارا یتیم اور معمولی انسان کی حیثیت سے کیا اور بالآخر عرب و عجم کی تاجدار کہلائی جس کا مقام قیصر و کسریٰ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اس نے ایک ایسی مملکت کی بنیاد ڈالی جو چودہ سو (اب پندرہ سو) سال سے اب تک چلی آرہی ہے۔ اگر کسی رہنما سے اس کے پیروکاروں کی عقیدتمندی عظمت کا پیمانہ ہے تو دنیا کے گوشہ گوشہ میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کی روحوں کو (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام ایک سحر انگیز کیفیت سے سرشار کیے ہوئے ہے۔

حالانکہ آپؐ نے ایتھنز، روم، فارس، ہند یا چین کی دانش گاہوں میں فلسفہ کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی پھر بھی آپؐ انسانیت کو لافانی اہمیت کی حامل عظیم ترین صداقتوں سے آگاہ کر سکتے تھے۔ اگرچہ آپؐ امی تھے تاہم آپؐ کی تقریر اتنی شستہ و رفتہ ہوتی تھی کہ سننے والوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے تھے۔ یتیم اور دنیوی وسائل سے محروم ہونے کے باوجود آپؐ سب کی آنکھوں کا تارا تھے۔ آپ کسی ملٹری اکیڈمی کے تربیت یافتہ نہ تھے لیکن آپؐ نے سخت مشکلات کے بالمقابل بڑی ذہانت سے اپنی فوجوں کو منظم کیا اور محض اخلاقی و روحانی طاقت کے بل بوتے پر فتوحات حاصل کیں۔ دنیا میں لوگوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا ہنر جاننے والے خداداد صلاحیتوں کے حامل افراد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ دیسقرطیس (DES CARTES) نے ایک مکمل معلمِ اخلاق کو نایاب ترین انسان قرار دیا ہے۔ ہٹلر نے اپنی مین کامپ (MIN KAMP) میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ "وہ کہتا ہے ایک نظریاتی انسان شاذ و نادر ہی عظیم قائد ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک تحریکی انسان میں قائدانہ صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک بہتر قائد ثابت ہوگا۔ کیونکہ قیادت کا مطلب ہے عوام میں عمل کی تحریک پیدا کرنا۔ قائدانہ صلاحیت کا فکر انگیزی سے کوئی تعلق نہیں۔" لیکن وہ مزید کہتا ہے "لیکن اس دنیا میں کسی شخص کا بیک وقت نظریہ پسند، منتظم اور قائد ہونا ایک بے نظیر منظر ہوتا ہے اور اسی میں عظمت کا راز نہاں ہے۔" پیغمبر اسلامؐ کے پیکر میں یہ عدیم المثال منظر مجسم ہو گیا تھا۔

بوسورتھ اسمتھ آپؐ کے متعلق اس سے بھی زیادہ وقیع خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے: "آپؐ

یک ہی فرمانروا بھی تھے اور دینی پیشوا بھی۔ آپ کی ذات میں قیصر اور پوپ یکجا ہو گئے تھے۔ آپ پوپ تھے لیکن پوپ کے غلط دعوؤں کے بغیر۔ آپ قیصر تھے لیکن قیصر کی عسکری طاقت کے بغیر۔ آپ کے پاس نہ کوئی باقاعدہ فوج تھی نہ محافظ، نہ محلات تھے نہ کوئی مستقل ذریعہ آمدن۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے صرف روحانی طاقت کے بل پر حکمرانی کی ہے تو وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات ہے کیونکہ آپؐ کے اقتدار کے پس پشت اس کے مادی لوازمات کارفرما نہیں تھے۔ آپؐ طاقت کے مادی مظاہر سے بے نیاز تھے۔ آپؐ کی نجی زندگی کی سادگی آپؐ کی عوامی زندگی میں جلوہ گر تھی"۔

فتح مکہ کے بعد دس ہزار مربع میل سے بھی زیادہ زمین آپؐ کے قدموں تلے تھی۔ عرب کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہوئے بھی آپؐ اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے، اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتے تھے، بکریوں کا دودھ اپنے ہاتھوں سے دوہتے تھے، گھر میں خود جھاڑو لگاتے تھے، چولھا جلاتے تھے، اور ادنیٰ سے ادنیٰ گھریلو کام خود انجام دیتے تھے۔ پورا مدینہ شہر جہاں آپؐ قیام پذیر تھے۔ آپؐ کی زندگی کے آخری ایام میں دولت مند ہو گیا تھا۔ ہر جگہ سونے اور چاندی کی ریل پیل تھی لیکن دولت کی فراوانی کے اس دور میں بھی شہنشاہ عرب کے گھر میں کئی کئی دن تک چولھا نہیں جلتا تھا اور آپؐ پانی اور کھجوروں پر گزارا کرتے تھے۔ آپؐ کے اہل بیت کئی کئی رات متواتر فاقے کرتے کیونکہ انھیں شام کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ آپؐ دن بھر کی تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد کسی نرم بستر پر آرام نہیں کرتے تھے۔ کھجور کی چٹائی آپؐ کا بچھونا ہوتی تھی۔ آپؐ کی راتیں عبادت میں گذرتی تھیں۔ اور آپؐ اپنے رب سے زور زور کر دعائیں مانگتے تھے کہ وہ آپؐ کو اپنے فرائض ادا کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ کہا جاتا ہے کہ شدت گریہ سے آپؐ کی آواز بندھ جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی دیگچی آگ پر رکھی ہو اور اس میں کھدبڑ نے لگا ہو۔ آپؐ کے وصال کے دن آپؐ کا کل سرمایہ چند سکے تھے جن میں سے کچھ قرض کی ادائیگی میں کام آئے اور باقی مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے زندگی کا آخری سانس لیا ان میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ گھر جس سے پوری دنیا میں ہدایت کا نور پھیلا اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ دیا جلانے کے لیے تیل نہیں تھا۔

حالات میں تبدیلی آئی لیکن اللہ کے رسولؐ میں نہیں، فتح و شکست، حاکمی و محکومی، امیری و ناداری، غرضیکہ ہر حالت میں آپؐ نے ایک ہی کردار کا مظاہرہ کیا، خدا کے قانون اور مشیت کی طرح اس کے رسولوں میں بھی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔

جیسا کہ کہا گیا ہے ایک ایماندار انسان خدا کی شاہکار تخلیق ہوتا ہے اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایماندار انسان سے بھی سوا تھے۔ انسان دوستی آپؐ کے رگ و پے میں بسی تھی۔ انسانی ہمدردی اور محبت آپؐ کی روح کا نغمہ تھی، آپؐ کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ تھا ـــــ انسانوں کی خدمت کرنا، ان کا کردار بلند کرنا، ان کے قلوب کا تزکیہ و تطہیر کرنا، مختصر یہ کہ انسانوں کو انسان بنانا، انسانیت کی فلاح اور بہبود کی فکر، آپؐ کے قول و فعل کی واحد محرک اور رہنما تھی۔

آپؐ انتہائی بے غرض اور نام و نمود سے دور رہنے والے تھے۔ آپؐ خود کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہتے تھے۔ آپ پہلے اللہ کے بندے اور پھر اس کے رسول تھے۔ دنیا کے ہر حصہ میں آنے والے بیشمار معلوم و نامعلوم نبیوں اور پیغمبروں میں سے ایک۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی ان دونوں حیثیتوں میں سے ایک پر بھی ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں۔ یہ تمام مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔

مغرب کے ایک مصنف کی رائے میں حالات اور آپؐ کے پیروکاروں کی آپؐ سے بے پناہ عقیدت کو نظر میں رکھتے ہوئے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت کا اعجاز یہ ہے کہ آپؐ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ کو معجزے دکھانے پر قدرت ہے۔ آپؐ نے معجزے دکھائے ضرور لیکن اپنے عقیدے کی تشہیر کے لئے نہیں۔ آپؐ ان معجزوں کو خدا کی حکمت و مشیت قرار دیتے تھے۔ آپؐ صاف الفاظ میں کہا کرتے تھے کہ آپؐ بھی دوسرے عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ نیز یہ کہ آپؐ دین اور دنیا کے خزانوں کے مالک نہیں ہیں۔ اور نہ آپ مستقبل کے بطن میں پوشیدہ رازوں سے آگاہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ سب کچھ آپؐ نے اس دور میں کہا جب کسی بھی درویش کے لیے کرشمے دکھانا معمولی بات تھی اور جب کہ عرب و عجم کا پورا ماحول غیبی اور غیر فطری طاقتوں پر ایقان کی بدعقیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو فطرت اور اس کے قوانین کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ خدا کی عظمت کے قائل ہو سکیں۔ قرآن میں آتا ہے "ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل میں نہیں بنایا۔ اس نے جو کچھ پیدا کیا وہ حق پر پیدا کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں" دنیا فریب نظر نہیں ہے اور نہ ہی اسے بے مقصد بنایا گیا ہے اسے تو حق پر پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن میں فطرت کا بغور مشاہدہ کرنے کی دعوت دینے والی آیات کی تعداد نماز، روزے اور حج وغیرہ سے متعلق آیات کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ ان آیات کے زیر اثر مسلمانوں نے فطرت کا قریبی مطالعہ دمشاہدہ کرنا شروع کیا اور نتیجۃً ان میں مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا سائنٹیفک مزاج پیدا ہوا جو اس وقت یونانیوں میں بھی مفقود تھا۔ جب کہ ایک مسلم ماہر نباتات ابن بیطار نے دنیا کے گوشے گوشے سے پودے جمع کر کے علم نباتات پر قلم اٹھایا جسے میئر نے (GESCHDER BOTANIKA) میں ایک عظیم کاوش قرار دیا جب کہ البیرونی معدنیات کے مختلف النوع نمونے اکٹھے کرنے کے لیے چالیس سال تک سفر کرتا رہا اور مسلمان ماہرین نجوم بارہ سال سے زائد مدت تک مشاہدات میں مصروف رہے۔ ارسطو نے ایک بھی تجربہ کئے بغیر علم طبعیات پر خامہ فرسائی کی اور تاریخ طبعیات لکھتے وقت اس کی لاپرواہی کا یہ حال ہے کہ اس نے یہ تو لکھ دیا کہ انسانوں کے دانت جانوروں سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس کی تصدیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ گیلن نے جسے علم جراحت پر عبور حاصل تھا، بتایا کہ انسان کے نچلے جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں اور دنیا اس بیان کو صدیوں تک بے چون و چرا صحیح تسلیم کرتی رہی تا اینکہ عبداللطیف نے ایک انسانی ڈھانچے کا معائنہ کر کے اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔ رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب تعمیر انسانیت (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے "ہماری سائنس صرف چونکا دینے والی ایجادات یا انقلاب آفریں نظریات ہی کے لیے عربوں کی ممنون احسان نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی بڑی بات کے لیے عرب ثقافت کی مرہون منت ہے اور وہ ہے خود سائنس کا وجود" یہی مصنف مزید لکھتا ہے "یونانیوں نے سائنسی نظریات کو منضبط، منظم اور عام ضرور کیا لیکن تحقیق و تفتیش کا صبر آزما کام، مثبت حقائق کی ذخیرہ کاری، سائنس کا دقیق اسلوب، تفصیلی اور وسیع مشاہدہ، تجربات پر مبنی تحقیق و تفحص یونانی مزاج کے لیے قطعی اجنبی تھے۔ آج یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس کا ظہور یورپ میں ہوا اور یہ کہ اہل یونان سائنس کے جدید طریقہ کار یعنی تجربہ، مشاہدہ، مساحت اور علم الحساب کی ترقی یافتہ شکل سے نابلد تھے۔ درآں حالیکہ اس سائنٹیفک مزاج اور اسلوب سے یوروپ کو متعارف کرانے والے عرب تھے۔"

یہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عملی کردار ہی تو تھا جس نے علمی مزاج کو جنم دیا اور جس نے عام انسانی کاوشوں اور نام نہاد دنیاوی معاملات کو عزّت و حرمت عطا کی۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن بندگی کا لفظ یہاں ایک مختلف اور وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ خدا کی بندگی صرف عبادت تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام جو اللہ کی رضا حاصل کرنے اور انسانیت کی فلاح کے لیے کیا جائے اس زمرہ میں آتا ہے۔

اسلام نے زندگی اور اس سے متعلق تمام افعال و اعمال کو قابلِ تکریم قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ ایمانداری انصاف اور صدقِ نیت سے کیے جائیں۔ اسلام نے مقدس و غیر مقدس کے درمیان چلے آرہے امتیاز کو ختم کیا۔ قرآن کہتا ہے اگر تم حلال چیزیں کھاتے ہو اور خدا کا شکر بجالاتے ہو تو یہ بھی عبادت ہے۔ آں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کے منھ میں اپنے ہاتھ سے نوالہ رکھتا ہے تو یہ بھی نیکی ہے، اللہ اس کا اجر دے گا۔ حدیثِ نبوی ہے کہ "جو شخص اپنی دلی خواہشات کی تکمیل کرتا ہے اسے اللہ جزا دے گا، بشرطیکہ اختیار کردہ طریقے جائز ہوں" ایک شخص جو آپؐ کا ارشاد سُن رہا تھا حیرت سے پکار اُٹھا "اے اللہ کے رسولؐ! ایسا شخص جو اپنے جذبات کی تسکین کرتا ہے، وہ تو اپنے نفس کی خواہشوں کو پورا کرتا ہے" آپ نے فی الفور جواب دیا "اگر وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے ناجائز طریقے استعمال کرتا تو کیا اسے اس کی سزا نہ ملتی، پھر اسے صحیح راستہ اختیار کرنے پر اجر کیوں نہیں ملے گا؟"

مذہب کے اس نئے تصوّر نے کہ انسان کو اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اس کی توجہ صرف غیر دنیوی معاملات پر ہی مرکوز نہیں ہونی چاہیے اخلاقی قدروں کو ایک نیا رُخ دیا۔ اس تصوّر کا عام انسانوں کے ذہنوں اور ان کے روزمرہ کے معاملات پر لافانی نقش چھوڑنا، ان کے

حقوق و فرائض کے نظریات میں باقاعدگی پیدا کرنا اور اس کا عالموں اور جاہلوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول اور قابل عمل ہونا، پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

لیکن یہ بات بطور خاص ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام میں اچھے سے اچھے عمل پر عقیدہ کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں مختلف مکاتیب فکر ہیں۔ اگر ایک مکتبِ فکر عقیدہ کو عمل پر فوقیت دیتا ہے تو دوسرے مکتب فکر میں صحت عقیدہ پر حسن عمل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلام کی بنیاد صحیح عقیدہ اور عمل صالح پر ہے۔ اسلام میں ذرائع بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ مقاصد اور مقاصد کی بھی وہی اہمیت ہے جو ذرائع کی۔ یہ تو ایک نامیاتی اکائی کی مانند ہیں۔ ان کی زندگی اور نشو و نما کا راز باہم مربوط رہنے میں پنہاں ہے اگر یہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو فنا ہو جائیں گے۔ اسلام میں عقیدہ کو عمل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح علم کو صحیح اعمال کی شکل دے کر صحیح نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ "جو خدا پر ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے صرف وہی جنت میں داخل ہوں گے" قرآن میں یہ الفاظ جگہ جگہ وارد ہوئے ہیں اور کم و بیش پچاس مرتبہ ان کا اعادہ کیا گیا ہے۔ اسلام میں غور و فکر کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے لیکن محض غور و فکر ہی مقصود نہیں۔ عمل سے عاری ایمان کا اسلام میں کوئی مقام نہیں ہے۔ قانون الٰہی ایک عملی قانون ہے نظریاتی یا تصوراتی نہیں۔ یہ انسانوں کے لیے دائمی ارتقار کا راستہ کھولتا ہے جو انھیں علم سے عمل اور عمل سے طمانیت کی طرف لے جاتا ہے۔

لیکن وہ صحیح عقیدہ کیا ہے جو انسان کو صحیح عمل کی راہ سے طمانیت کی منزل تک لے جاتا ہے وہ ہے اسلام کا بنیادی اصول خدا کی وحدانیت یا توحید۔ اسلام میں تمام افکار و اعمال کا محور یہ کلمہ ہے کہ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا اور بے مثل ہے۔

جہاں تک خدا کی صفات کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بھی اسلام کا متذکرہ بالا سنہری اصول کارفرما ہے۔ اگر یہ ایک طرف خدا کی ذات کو تمام صفات سے عاری قرار نہیں دیتا تو دوسری طرف اس کو مادی صفات سے متصف کرنے کے نظریہ کو بھی باطل ٹھہراتا ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ اس جیسا کوئی دوسرا نہیں تو دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ وہ دیکھتا، سنتا اور جانتا ہے۔ وہ ایسا حاکم اعلیٰ ہے کہ جس سے کوتاہی یا غلطی سرزد نہیں ہو سکتی اور اس کی حاکمیت کی بنیاد انصاف اور مساوات پر ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ اسلام صرف اقراری پہلو ہی پیش کر دینے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ انکاری رخ بھی سامنے لاتا ہے جو اس کی نمایاں خصوصیت ہے وہ یہ کہ اس کے سوا کوئی دوسرا رب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ٹوٹے دلوں کا جوڑنے والا ہے۔ اس کے علاوہ شکستہ دلوں کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ وہ ہر نقصان کی تلافی کرنے والا ہے۔ اس ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ وہ جسموں کا بنانے والا اور

روحوں کی تخلیق کرنے والا ہے۔ وہ قیامت کے دن کا مالک ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ تمام اعلیٰ ترین صفات کا مالک ہے۔

انسان اور کائنات کے رشتہ کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: "خدا نے جو کچھ اس زمین پر اور کائنات میں ہے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ کائنات پر تمہاری حکمرانی ہے" لیکن خدا کے بارے میں قرآن کہتا ہے" اے لوگو! خدا نے تمہاری تخلیق بہترین تقویم سے کی ہے۔ زندگی اور موت پیدا کی یہ دیکھنے کے لیے کہ کس کے اعمال صحیح ہیں اور کون راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔"

کسی حد تک خود مختار ہونے کے باوجود انسان کچھ مخصوص حالات کی پیداوار ہوتا ہے اور کچھ ایسے حالات میں زندگی بسر کرتا ہے جو اس کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق خدا کا فرمان ہے کہ میں انسان کو ایسے حالات میں پیدا کرتا ہوں جو میرے نزدیک اس کے لیے انتہائی مناسب ہوتے ہیں۔ ان آفاقی منصوبوں کو فانی انسان پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن میں تمھیں آزماؤں گا خوشحالی اور بدحالی میں، صحت اور بیماری میں، عروج اور زوال میں۔ میری آزمائش کے طریقے ہر انسان اور ہر وقت کے لیے مختلف ہیں۔ مصیبت کے وقت مایوس نہ ہو اور ناجائز ذرائع استعمال مت کرو۔ یہ ایک عارضی صورت حال ہے۔ خوشحالی میں خدا کو فراموش نہ کرو۔ خدا کی نعمتیں تو امانت کی طرح ہیں۔ غرض ایک مسلسل آزمائش ہے جس میں ہر لمحہ اور ہر گھڑی امتحان کی ہے۔ زندگی تو مکمل تسلیم و رضا، خود سپردگی و جاں نثاری کا نام ہے۔ جینا ہے تو اس کی ہدایت کے مطابق جیو اور مرنا ہے تو اس کی رضا میں مرو۔ آپ اسے تقدیر پرستی تو کہہ سکتے ہیں لیکن یہ تقدیر پرستی تو ایک ایسی حیات آفریں سعی پیہم کا نام ہے جو آپ کو ہر لمحہ خبردار و ہوشیار رکھتی ہے۔ اس ارضی اور دنیوی زندگی کو انسانی وجود کی آخری منزل نہ سمجھو۔ موت کے بعد ایک دوسری دنیا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہے۔ حیات بعد موت ہی تو زندگی کے راز سربستہ کو آشکار کرنے والی ہے۔

زندگی کا ہر عمل خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو دیرپا اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ تمہارے اعمال نامہ میں درج کر لیا جاتا ہے۔ خدا کی کچھ حکمتوں کو تو تم سمجھتے ہو لیکن اس کی بیشتر حکمتیں تمھیں معلوم نہیں۔ اس دنیا میں جو چیزیں تم سے چھپی ہوئی ہیں دوسری دنیا میں ان پر سے پردہ اٹھا دیا جائے گا اور تمھیں سب کچھ صاف صاف دکھا دیا جائے گا۔ متقی اور پرہیزگار لوگوں کو خدا کی ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ جو ان کی آنکھوں نے نہ کبھی دیکھی ہوں گی، نہ ان کے کانوں نے کبھی سنی ہوں گی اور جن کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ ان کے درجات میں اضافہ ہوتا جائے گا یہاں تک کہ وہ ارتقائے روحانی کے بلند سے بلند تر مراتب کو پہنچ جائیں گے جنھوں نے اس زندگی میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا

موقع گنوا دیا، انھیں قانونِ مکافات کے تحت اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی اور انھیں اس روحانی بیماری سے نجات دلانے کے لیے ایک سخت طریقۂ علاج اختیار کیا جائے گا۔ خبردار کہ یہ بہت دردناک عذاب ہوگا۔ جسمانی عقوبت تو قابلِ برداشت ہوتی ہے لیکن روحانی اذیت جہنم سے کم نہیں ہوتی، اسے برداشت کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا اس زندگی میں ان نفسانی خواہشات سے جنگ کرتے رہو جو تمھیں گمراہی اور معصیت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ تمھارا ضمیر اور اس کی احتسابی قوت بیدار ہو جائے اور تمھارے دل میں اعلیٰ اخلاق اوصاف حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو جائے اور تم سرکشی و نافرمانی کا راستہ چھوڑ دو۔ تب روحانی سکون اور اطمینانِ قلب کی آخری منزل پر پہنچ جاؤ گے یعنی رضائے الٰہی کے حصول کی منزل۔ اور تمھاری تمام خوشیوں کا منتہیٰ صرف خدائے واحد کی خوشنودی حاصل کرنا ہوگا۔ اس منزل میں روح کے بھٹکنے کا امکان نہیں رہتا۔ تذبذب کشمکش اور آویزش کا مرحلہ گذر چکا ہوتا ہے، حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ تمام الجھنوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ذہنی خلفشار سے نجات مل جاتی ہے۔ تب تمھارے دل میں ہمہ تن راضی برضا رہنے اور خود کو مکمل طور پر خدا کی مرضی کے حوالے کر دینے کی کیفیت پیدا ہوگی۔ تمھاری تمام مخفی طاقتیں بروئے کار ہوں گی اور تمھاری روح کو مکمل طمانیت حاصل ہوگی۔ پھر خدا تم سے مخاطب ہو کر کہے گا: "اے مطمئن روح! تجھے خدا کی مکمل رضا حاصل ہوئی۔ اپنے رب کی طرف لوٹ چل، وہ تجھ سے راضی ہوا اور تو اس سے۔ تو میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

یہ ہے اسلام کی نظر میں انسان کا منشائے مقصود۔ ایک طرف وہ تسخیرِ کائنات کے لیے مصروفِ جہد عمل ہے اور دوسری طرف اس کی روح اللہ کی رضا میں ابدی سکون تلاش کرتی ہے۔ نہ صرف اس کا اللہ اس سے راضی ہوگا بلکہ وہ بھی اپنے اللہ سے راضی ہوگا۔ انجام کار اسے ملے گی قناعت اور مکمل قناعت، طمانیت اور مکمل طمانیت، سکون اور مکمل سکون۔ اس منزل میں عشقِ خدا اس کی روحانی غذا ہوگی۔ اور وہ سرچشمۂ حیات سے جی بھر کر اپنی پیاس بجھائے گا۔ پھر وہ کسی غم سے مایوس اور کسی خوشی میں جامے سے باہر نہیں ہوگا۔

تھامس کارلائل اس فلسفۂ حیات سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے "اسلام کا مطالبہ یہی تو ہے کہ ہمیں خود کو خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ہماری تمام قوتوں کا سرچشمہ خدا کے لیے ہماری مکمل خودسپردگی ہے۔ وہ جو کچھ ہمارے لیے کرتا ہے اور جو چیز بھی اس کی طرف سے بھیجی جاتی ہے خواہ وہ موت ہی کیوں نہ ہو یا اس سے بھی بدتر کوئی چیز اس میں ہمارے